علم کو اسلامی کرنا

مصنف: اسمٰعیل راجی الفاروقی

تبصرہ (فارسی): دکتر ھادی شریفی
ترجمہ: ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

کتاب Islamization of Knowledge کا مؤلف ان مسلمانوں پر، جو ان دو ایک صدیوں کے دوران عالم اسلام میں اجتماعی و سیاسی تغیرات کے نتیجے میں ہونے والی پیشرفت اور تجدد کے طرف دار اور اپنے مقاصد تک رسائی کے لیے بغیر کسی تفریق و تمیز کے، اسلام سے موافقت نہ رکھنے والے جدید علوم اور مغربی ملاحظات کی طرف متوجہ ہیں، تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے: ان کی اور ان جیسے لاکھوں افراد کی تمام تر جستجو اس فرض پر مبنی تھی کہ علوم جدید کے مباحث و موضوعات بے ضرر ہیں اور صرف مسلمانوں کے لیے قوت بخش ہیں۔ انہوں نے اس بات کو سمجھا ہی نہیں کہ اجنبی اور خارجی علوم انسانی و اجتماعی تنہا علوم طبیعی واقعیت سے، زندگی سے، دنیا سے اور تاریخ سے باہم پیوستہ موقف کے ایسے پہلو ہیں جو اسلامی موقف سے بالکل جدا اور اجنبی ہیں۔ وہ اس نازک اور ضروری رابطے سے بہت ہی کم آگاہ تھے جو ان علمی موضوعات کی طرز و روش اور حقیقت اور علم کے بارے میں ان کے تصورات کو ایک اجنبی و بیرونی دنیا کے وقیع نظام سے باہم ملاتا تھا۔ اسی بنا پر ان کی اصلاحات بے سود ٹھہریں۔ ایک طرف نوجوں کی توں اسلامی تعلیم کی منجمد کیفیت باقی رہ گئی اور دوسری طرف جدید تعلیمات ہرگز اس بلندی تک نہ پہنچ سکیں جو انہوں نے اپنی مادری سرزمین میں پیدا کی تھیں اس کے برعکس ان تعلیمات نے مسلمانوں کو غیروں کی تحقیقات و رہبری سے وابستہ کر دیا۔ جدید علوم، علمی عینیت کے پر طمطراق دعوے کے ذریعے اس امر میں کامیاب ہو گئے کہ ان تجدد کے طرف دار مسلمانوں سے اپنی حقیقت منوالیں، ایسی حقیقت جو ان کے زعم میں، اسلام سے برتر و بالاتر تھی، اور وہ اسلام جو پیشرفت کے طرف داروں کی نظر میں رجعت پسند اور پسماندہ تھا۔" (منقول از مقدمہ کتاب)

قاری جب مندرجہ بالا قول پڑھتا ہے تو مؤلف کو حق بجانب جانتا ہے اور اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ وہ اپنے نظریے کی توجیہ اور راہ حل کی نشاندہی میں اس تفریق و تمیز پر قائم رہے گا۔ اور دوسروں کی ناکامی کے اسباب فراموش نہ کرے گا۔ اب دیکھتے ہیں کہ مؤلف کیا کہتا ہے اور اس کے تھیلے میں بلی ہے کہ نہیں؟

ایک چھوٹی سی کتاب جسے اسماعیل راجی الفاروقی نے حال ہی میں اسلامائیزیشن آف نالج کے نام سے تالیف کیا

اور جو انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اگرچہ چھوٹی ہے لیکن بڑے دعوے کی حامل۔ کتاب چار ابواب اور ایک ضمیمے پر مشتمل ہے۔ مؤلف نے سب سے پہلے مسئلے کی توضیح کی طرف توجہ کی ہے اور امت مسلمہ کی مریضانہ حالت پر بات کی ہے۔ ازاں بعد سیاست، اقتصادیات، دین اور تہذیب و تمدن و علم کے میدان میں اس کے اثر کو موضوع بحث بنایا اور اس بیماری کے سبب پر جو اسلامی معاشروں کے نظام تعلیم و تربیت میں پایا جانا چاہیے، غور و فکر کیا ہے۔ دوسرے حصے میں بیماری کے طریقہ علاج کی بات ہوئی ہے جو مؤلف کی نظر میں وحدت اسلامی، جدید تعلیم و تربیت اور اسلامی بصیرت کے القاب سے عبارت ہے۔ اس حصے میں جو بظاہر کتاب کے پیغام کی تشکیل کرتا ہے، علم کو اسلامی رنگ دینے کی بات کی گئی ہے۔ کتاب کا تیسرا حصہ اس کام کی روش اور منہاج سے مخصوص، عالم اسلام میں مروجہ روایتی طریقوں کی مشکلات نیز بعض بنیادی مسائل مثلاً فقہ اور فقیہ، اجتہاد اور مجتہد، اختلاف وحی و عقل، فکر و عمل میں تفاوت اور تعلیمی دورخی کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس حصے میں اسلامی روش کے اصول بیان کئے گئے ہیں، جو مباحث کل کے ایک سلسلہ کو محیط ہیں، جیسے وحدت حق، وحدت خلق، نظم عالم، آفرینش، وحدت حقیقت اور وحدت علم، وحدت حیات اس عنوان کے تحت امانت الٰہی، انسان کی خلافت اور جامعیت اسلام پر مؤلف نے اپنے خیال کے مطابق بات کی ہے۔ اور آخر میں وحدت انسانیت۔

چوتھے حصے کو بنیادی خاکے کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں ایسے اقدامات کا ذکر ہے جو علوم کو اسلامی بنانے کے لیے کرنے چاہئیں، مثلاً جدید علوم سے واقفیت اور ان پر احاطہ، اسلام کے علمی ورثے سے آشنائی، متعلقہ علوم سے اسلام کے خاص ربط کو برقرار رکھنا، اسلام کے ڈھانچے میں کسی علم کا نیا تجزیہ و تحلیل اور اسے نئی بنیاد اور ترکیب دنیا۔ اس حصے کی بنیادی غرض یونیورسٹی سطح کی کتابوں کی تیاری اور آخر میں ان علوم کی نشر و اشاعت ہے جو اسلامی بنا لیے جائیں گے۔

اسی حصے میں بعض دیگر اقدامات کا ذکر ہے جو علوم کو اسلامی بنانے میں مدد و معاون ہوں گے جن میں سے ایک بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمیناروں کا انعقاد ہے، مسلمان علماء اور مفکرین کو یکجا کر دیں تاکہ اجتماعی طور پر غور و خوص، بحث تمحیص اور تبادلہ خیالات سے متعلقہ مسئلے کی طرف توجہ دی جا سکے اور آخر میں یونیورسٹیوں کی تعلیمی ہیئت کا مسئلہ سامنے رکھا گیا ہے۔ کتاب کے تین ضمیمے اس کانفرنس کی مختصر رپورٹ پر مشتمل ہیں جو اسی موضوع "علم کو اسلامی بنانا" پر ۱۹۸۲ء میں اسلام آباد (پاکستان) میں منعقد ہوئی۔ بعد ایک تعلیمی نصاب کی تجویز ہے جس کے بارے میں مؤلف کا خیال ہے کہ یہ سارے اسلامی ممالک یونیورسٹیوں میں تمام طلباء کے لیے لازمی قرار دیا جائے۔ آخری ضمیمہ رشتہ ہائے علمی کے تاریخی تعارف اور موضوع و مسائل کے بارے میں ایک سلسلہ سوالات پر مشتمل ہے۔ نیز ان سے اسلام کا رابطہ کہ ان سوالات پر ہر شعبہ علم کے مسلمان دانشمندوں کو غور و تامل کرنا چاہیے

کتاب کے مؤلف نے جو اصلاً فلسطینی اور آج کل ٹمپل یونیورسٹی امریکا کے شعبہ مذاہب میں پروفیسر ہے، تاریخ اسلام سے متعلق اپنے تخصص اور معلومات کی بنا پر کتاب کے پہلے حصے میں جو مسئلے کا اساسی خاکہ ہے ایک ماہر عمرانیات

کی نظر سے (جو سیاسی جانبداری اور تعصب سے مبرا نہیں) امت مسلمہ کی مشکلات کو مختصر طور پر بیان کیا ہے۔ وہ ملت اسلامیہ کی مریضانہ حالت اور مصیبتوں کی بات کرتا ہے۔ سیاست کے میدان میں اسلام کے واحد معاشرے کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے اور خانگی دشمنیوں پر جنہیں وہ استعمار کے اثر و نفوذ کا نتیجہ سمجھتا ہے، اس کا دل کڑھتا ہے۔ اقتصادیات کے شعبے میں اس ملت کی "پسماندگی، زوال آمادگی" اور اکثریت کی ناخواندگی کا شکوہ کرتا ہے۔ مغربی اور مشرقی ملکوں کے ساتھ اسلامی ممالک کی وابستگی۔ لفظ کے سیاسی مفہوم میں۔ اور ان کی ناقص اقتصادی منصوبہ بندی کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔

مؤلف گذشتہ دو ایک صدیوں میں تعلیمی میدان میں کی جانے والی ان کوششوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو مسلم ممالک کے سربراہوں کے وسیلے سے مسلمانوں کو مغرب زدہ بنانے۔ اور ان میں تجدد اور ترقی پرستی کی روح پھونکنے کے سلسلے میں بروئے کار لائی گئیں۔ اس کے نظریے کے مطابق ان کوششوں کا نتیجہ، تعلیم و تربیت کے ایک عالمی نظام کی تاسیس میں ظاہر ہوا جس نے مغربی اقدار اور اطوار کی تعلیم دی۔ اس نظام نے بہت جلد معاشرے میں ایسی نسلوں کو جنم دیا جو اپنی اسلامی میراث سے بالکل ناآشنا تھیں،،۔

وہ مزید کہتا ہے کہ مغرب کی مشینی (مکینیکل) تعلیم نے ہمارے شہروں، بازاروں، گلی کوچوں اور گھروں میں دخیل ہو کر ہماری وحدانی طرز زندگی کو انتشار اور تباہی سے دوچار کر دیا ہے جس سے ہمارے شہروں اور گھروں کی اسلامی فضا مکدر ہو کے رہ گئی ہے۔

ہمارے شہروں میں اسلامی فن تعمیر مٹ چکا ہے۔ شہروں کی اسلامی طرز کی بنیادگزاری کا سرے سے کوئی وجود نہیں رہا۔ کسی شہر کے ترقی یافتہ بیشتر مراکز وہی اشتباہات اور نقائص دہراتے نظر آتے ہیں جو یورپ کے صنعتی شہروں میں دو صدی قبل صنعتی انقلاب آجانے کے بعد وقوع پذیر ہوئے تھے۔ گویا ہم اتنے گندے ہیں کہ دوسروں کے تجربات سے کچھ سیکھ بھی نہیں سکتے۔ ہمارے گھر گھر کے وسائل، ہمارے سجاوٹ کے فنون اور انداز وغیرہ سبھی ان اطوار میں سے ہیں جو ہماری چھنے خانی کے آشفتہ تصور کی نشاندہی کرتے ہیں،، (ص ۵)

مؤلف اس معاملے میں آخر اس نتیجے پر پہنچا ہے۔ کہ ملت اسلامیہ کو مغرب زدہ اور تجدد دلپسند بنانے کی بیہودہ کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مغرب زدہ مسلمان کا انداز زندگی نہ اسلامی رہا نہ مغربی۔

امت مسلمہ کے اس مرض کا سبب مؤلف کے نزدیک، موجودہ نظام تعلیم و تربیت ہے۔ جو ساتھ ساتھ بیماری کے برقرار رکھنے کا بھی باعث بن رہا ہے۔ وہ اس نکتے کو یوں بیان کرتا ہے۔

"اس بات میں ذرہ برابر شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ملت کی بیماری کا بنیادی سبب تعلیم و تربیت کا موجودہ نظام ہے۔ یہ نظام بیماری کی افزائش کے لیے سامان مہیا کرتا ہے۔ یہ سکول اور کالج ہی ہیں جہاں اسلام اور اسلامی میراث و اطوار سے دوری و غیرت کا احساس جنم لیتا اور نشو پاتا ہے۔ موجودہ نظام تعلیم و تربیت ایک ایسی تربیت گاہ ہے جس میں مسلمان نوجوان نسل کو نسل توڑا اور ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا ہے۔ ایک ایسی جگہ ہے جہاں اس نسل کا فہم و آگہی

مغرب کے مضحکہ خیز خاکے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہاں مسلمانوں کا اپنا ماضی سے رابطہ کٹ جاتا ہے۔ اور اپنے اسلاف کی میراث تک رسائی کے لیے اس کی فطری تحقیق و جستجو بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس بجا اس کا اس میراث کی بنیاد تک پہنچنے کا رجحان اور شارعِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) سے وابستگی پیدا کرنے کی جد و جہد ان شکوک و شبہات کی بنا پر سست اور کمزور پڑ جاتی ہے، جو جدید نظامِ تعلیم نے اس کے شعور کے کونوں کھدروں میں چھپا دیے ہیں (ص ۵)

اس بحث کو جاری رکھتے ہوئے مؤلف نے مسلم معاشروں میں تعلیم کی موجودہ صورتحال کو موضوعِ تحقیق بنایا اور حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تمام عالمِ اسلام میں اس وقت دو نظام موجود ہیں۔ اوّل جدید نظامِ تعلیم و تربیت جو مطلقاً مغربی ہے مگر عام ہے اور جسے مسلمان حکومتوں اور اربابِ اختیار کی حمایت حاصل ہے۔ (اور مزے کی بات یہ ہے کہ) یہ عوام الناس کے بجٹ پر اچھل کودتا ہے۔ دوسرا وہ روایتی اسلامی نظام جس نے کم و بیش ایک خاص امر کی صورت اختیار کر لی ہے اور جو مسلم معاشروں کے ان گوشوں میں جہاں کہیں افرادِ خیر و طالبِ فلاح ہیں، کسی قدر خود کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

اسلامی تعلیم و تربیت کے اداروں، ان کے نصاب اور طور طریقوں کے بارے میں مؤلف کا اندازہ ناقدانہ ہے۔ اس کے مطابق روایتی اسلامی اداروں کا نصاب اور ان کے طریقے جوں کے توں اور کسی تبدیلی کے بغیر قائم و برقرار ہیں۔ وہ اس کا سبب ان تین باتوں کو جانتا ہے۔ اول رجعت پسندی، دوم افراد و اشخاص کا مفاد اور آخر میں استعمار کا نفوذ و دخول جس نے اپنے زعم میں ان اداروں کو حقیقت اور تجدد کی قربت سے دور رکھا ہوا ہے تاکہ ان کے فارغ التحصیل طلبہ مغرب کے عالمی اداروں کا طلسم نہ توڑ سکیں،، (ص ۶) فاروقی کے گنوائے ہوئے تمام اسباب و علل یا ان میں سے چند ایک بھی سارے کے سارے مسلم ممالک میں نہیں پائے جاتے۔ بہرحال چونکہ ہم اس (مؤلف) کے نظریات کی تنقید میں بتدریج داخل ہو رہے ہیں اس لیے اس لمحہ تک پہنچنے کے لیے صبر و سکون سے کام لیتے ہیں۔

اس کی یہ بات بھی درست ہے کہ مسلم ممالک میں جدید مغربی اداروں کی تاسیس و توسیع کے لیے کی جانے والی تمام کوششوں کا نتیجہ مغربی سانچوں کی اپنے ٹھوس مفہوم میں صحیح اور حقیقی صورت میں نہیں نکلا بلکہ ان کا ایک مضحکہ خیز خاکہ ہے۔ اس (مؤلف) کے مطابق علمی روح لائقِ تقلید نہیں ہے۔ اس کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ اسی وجہ سے مسلم معاشرے کوئی ایسا علمی ادارہ قائم نہیں کر سکے جو مغربی علمی اداروں (جو ان کا ماڈل تھے) کی سطح کے ہوں۔ اسی بحث میں مؤلف مغرب میں قوم پرستی کے ظہور کی طرف مختصر اشارہ کرتا ہے، اور یہ کہ قوم پرستی ایک مؤثر محرک و عامل کے طور پر مغربی یونیورسٹیوں کی توسیع و ترویج کا باعث بنی۔ وہ (مؤلف) مسلم معاشروں کے درمیان دانشگاہی علمی تحریک پیدا کرنے کے سلسلے میں ایک مثبت عامل کے طور پر قوم پرستی کی صحیح نفی کرتا ہے اور اسے (قوم پرستی کو) ملتِ اسلامیہ کی خصوصیات سے بالکل الگ گردانتا ہے کہ بنیادی طور پر نیشنلزم کا سہارا نہیں لینا چاہیے۔

مسلم ممالک کے یونیورسٹی کے اساتذہ کی وضع قطع سے متعلق اس کا شکوہ اس طرح ہے کہ بقول اس کے ان میں

اسلامی بصیرت کا فقدان ہے اور وہ اسلامی رجحان سے عاری ہیں۔ طلبا جب یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں، تو ممکن ہے اس سے قبل گھر اور مدرسہ میں انہوں نے وہ اسلامی احساس پایا ہو لیکن ان کا یہ احساس کچھ اتنا گہرا نہیں ہوتا کہ وہ مغرب کی مختلف علمی و فکری آئیڈیالوجیز اور عقائد و نظریات کے سامنے ٹھہر سکے جو "واقعات و حقائق" اور "علمی عینیت" کے خلاف میں ظاہر ہوتے ہیں۔ آخر میں وہ بجا طور پر یہ اعتراض اٹھاتا ہے کہ "عالم اسلام میں کہیں بھی تمام طلبا کو مغربی بصیرت یعنی ایسی بصیرت جو باہم پیوستگی، کلیت، سخت کوشی و محنت اور ذمہ داری کے ساتھ قائم ہو۔ عالم اسلام کی کسی بھی یونیورسٹی میں اس قسم کی بصیرت تمام طلبا کے لیے لازمی تعلیم کے نصاب کا ایک بنیادی جز اور عنصر نہیں ہے" (صفحہ ۱۸)۔

اس بحث کے اختتام سے پیشتر اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ جو کچھ الفاروقی نے مسئلے کے خاکے کے طور پر بیان کیا ہے اسے دوسروں نے بھی اس سے قبل اور اس سے زیادہ گہرائی کے ساتھ کہا اور بار بار کہا ہے۔ تاہم چونکہ یہ اظہار درد کا مسئلہ ہے اس لیے اسے نئے سرے سے بیان کرنا کسی نقصان کا باعث نہیں بلکہ مؤثر بھی ہو سکتا ہے۔

لیکن درد دل کا بیان اور مسئلے پر گرفت اگرچہ مفید تو ہے مگر راہ کشا نہیں۔ الفاروقی حل مسائل کا راستہ بھی دکھاتا ہے اچھا ہوگا کہ ہم پہلے اس کی بات سنیں۔۔ دیکھیں وہ کیا کہتا ہے۔ اگر اس کی بات نادرست اور اسلامی روح اور حقیقت دگی سے ہٹ کر ہے تو سکوت جائز نہیں، لیکن اگر اس نے سچی بات کی ہے تو سچ سے ہم نہیں الجھتے۔

مؤلف کتاب کے دوسرے حصے میں راہ حل کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کا تجویز کردہ حل بڑی رجائیت پسندانہ ہے۔ اور ان الفاظ میں سمویا جا سکتا ہے کہ آج تعلیم و تربیت کے یہ دو نظام۔۔۔ روایتی اسلامی نظام اور جدید نظام۔۔۔ ایک اور باہم متحد ہونے چاہئیں۔ اس کے خیال میں یہ اتحاد ایسا ہو جو دونوں کے مفادات اور امتیازات کو ایک جگہ جمع کر دے، اور وہ اس طرح کہ حکومت جو فی الحال جدید طرز تعلیم کی طرف متوجہ ہے، ان دونوں نظاموں کو برابر کا درجہ دے اور ان کو اپنی مالی امداد میں مساویانہ شریک کرے۔ اس ضمن میں مؤلف بلاشبہ بجٹ اور حکومت اور معاشرے کے ارباب مرتبہ کی حمایت کے مسئلے پر زیادہ زور دیتا ہے اور یہ تاکید و اصرار اگرچہ حامل اہمیت ہے لیکن چونکہ ان دو متفاوت طرز ہائے تعلیم کے اتحاد اور آمیزش کا نظریہ، فلسفیانہ اور عقلی مسئلہ پوری طرح مورد تحقیق اور بنیاد پذیر ہی نہیں ٹھہرا، اس کے حل ہونے کی بات تو ایک طرف رہی، اس لیے یہاں بجٹ اور ارباب اختیار و مرتبہ کی حمایت کی بات زیادہ مناسب نہیں۔

ان دو نظام ہائے تعلیم کے ایک ہو جانے کے بعد جو بڑا سادہ اور سطحی دکھائی دیتا ہے، مؤلف کتاب مدرسں اور کالجوں یونیورسٹیوں کے طلبا میں اسلامی بصیرت کی پرورش اور تربیت و ترغیب کے مسئلے کی طرف آتا ہے اور اجنبی و خارجی نظریات کے مقابلے کے لیے جو علم اور تجدد پسندی (ماڈرن ازم) کے نام سے طلبا پر ٹھونسے جا رہے ہیں، یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ اسلامی علوم و معارف سے متعلق تعلیم ایک منظم، لازمی اور عمومی پروگرام کی صورت میں، بعین چار سال کے عرصے میں (مدرسہ، کالج، یونیورسٹی کی سطح کے) تمام طلبا کو دی جائے۔ ان اسباق کی تدریس کا مقصد بھی اسلامی علوم و افکار سے آشنائی اور ان کی شناخت کی وساطت سے طلبا میں اپنی ذات کی پہچان پیدا کرنا ہے۔ وہ (مؤلف) افکار اسلامی کے ایک

مرکز کے قیام کو بھی لازمی سمجھتا ہے۔ کیونکہ وہاں اسلامی مفکروں کی مدد اور اشتراک سے علوم کو اسلامی بنانے کا ارادہ عملی پذیر ہو سکتا ہے۔

ازاں بعد علم کو اسلامی بنانے کا مسئلہ پیش کیا گیا ہے جس کی پہلی شرط جدید علوم پر گرفت و احاطہ اور اسلامی میراث سے اس کا ربط و پیوند ہے۔ اس آمیزش و پیوند کا نتیجہ اسلامی شدہ علم کی صورت میں ہونا چاہئے۔ مؤلف یہاں اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ کام بے حد دشوار ہے اور کسی نے بھی اس راہ میں سنجیدگی سے قدم نہیں رکھا۔ اس (مؤلف) کا یہ اشارہ لائق اعتناء ہے کہ وہ لوگ جو اس میدان میں کام کرنے کا ارادہ رکھتے تھے انہیں مغربی علوم اور اسلامی بصیرت میں باہمی تضاد اور تصادم تک کا علم نہ تھا۔۔ (ص ۱۴) گویا مؤلف اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ ایسا کوئی تصادم موجود ہے اور وہ خود بھی اس سے آگاہ ہے۔ لیکن جب وہ عملاً اپنے نظریہ و عقیدہ کے اظہار میں زیادہ وضاحت اور صفائی سے کام لیتا ہے تو نہ صرف اس تضاد اور تصادم کا نوٹس نہیں لیتا بلکہ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، اسلامی موقف کو اپنے ادراک اور اس تعریف کی بنیاد پر جو اس کے سامنے آتی ہے۔ کچھ اس حد تک نیچے لے آتا ہے جیسے علوم جدیدہ سے اس کا کوئی ٹکراؤ نہیں۔

اب ہم اس کی "علم کو اسلامی بنانے" کی تعریف کی طرف آتے ہیں۔ "علم کی نئی بنیاد کچھ اس طرح رکھنا کہ اسلام کا اس سے ربط پیدا ہو، علم کو اسلامی کرنا ہے۔ دوسرے بیان کے مطابق، علوم کی تعریف نئے سرے۔ مقررات کی نئے سرے ترتیب و تنظیم، مقررات کو پھر سے ربط دینا۔ استدلال کرنا اور سوچنا، نتائج کی قدر و قیمت کا تعین نئے سرے، مقاصد کی بازگشت نئے سرے، اور یہ سب امور اس طرح روشنا ہوں کہ تمام علمی شعبے اسلامی بصیرت کو بالا مال کر دیں اور مقصد و ہدف اسلام کے کام آئیں، (ص ۱۵) مذکورہ بالا مقاصد و اہداف کی تصدیق و اثبات کے لیے ضروری ہے کہ وحدت حق، وحدت علم، وحدت انسانیت۔ انسان کے سامنے فطرت کی تسخیر پذیری اور خدا کے حضور انسان کی خود سپردگی جیسی اسلامی طبقہ بندی، اطوار و انداز مغرب کے اوضاع و اطوار کی جگہ لے لیں، اور لازم ہے کہ ہمارے ادراک کا تعین اس کی واقعیت و حقیقت، وجود و ترتیب سے ہو۔

جو تعریف آپ کی نظر سے گزری اس امر کی متقاضی ہے کہ پہلے اس کے تمام اجزاء کی ٹھوس تعریف و توضیح ہو۔ دوسرے زیر بحث دو طرزوں کی جاگزینی کی کیفیت کی ٹھیک ٹھیک توجیہ ہو، وہ بھی اس صورت میں کہ وحی اسلامی کا اصل مقصد جو انسان کو خدا، عالم غیب اور عالم ملکوت و معاد سے ملانے سے عبارت ہے، نظروں سے اوجھل نہ ہو۔

یہاں مؤلف اپنے نظریے کی توجیہ کی خاطر اسلامی طرز کی بحث میں داخل ہوتا ہے اور اس امر میں بھی وہ پہلے موجودہ اسلامی روشوں پر تنقید کرتا ہے۔ اس تنقید میں وہ تین ایسے مسائل چھیڑتا ہے جو تمام عالم اسلام میں کہیں بھی ایک جیسے نہیں۔ یہ تین مسئلے ہیں۔ اجتہاد اور مجتہد، فقہ اور فقیہ اور وحی کا عقل کے ساتھ تضاد۔ اوّل الذکر دو مسائل کے بارے میں اس کا اعتراض یہ ہے کہ دین میں اجتہاد اور فقہ و تفقہ کا باب، جیسا کہ آغاز اسلام

میں معمول تھا، بند ہو چکا ہے۔

تیسرا مسئلہ یعنی وحی کا عقل کے ساتھ تضاد ایک اہم اور بنیادی مسئلہ ہے جسے علم کو اسلامی بنانے، جیسے بحث میں سنجیدگی سے اور منطقی اور عقلی انداز میں زیر غور لانا چاہیئے۔ کیا وحی اسلامی واقعی عقل کے ساتھ تضاد اور مخالفت کی حامل ہے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو قرآن کریم کے تمام ارشادات جنہیں اہل عقل و دانش خوب سمجھتے ہیں نیز انسانی عقل کی عظمت سے متعلق ایسی تمام احادیث جو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آئمہ (رحمہم اللہ علیہم اجمعین) سے منسوب ہیں، باطل و بیکار ہیں لیکن اگر وحی کا عقل کے ساتھ تضاد نہیں ہے تو پھر جدید علم اور جدید علماء وحی کو تسلیم کیوں نہیں کرتے؟ محترم مؤلف کی مسئلے کے ان دقائق تک رسائی نہ تھی یا رسائی نہیں ہوتی اور عقل سے بھی اس کا مقصد ومطلب ذہن انسانی کے محض استدلالی پہلو سے ہے جو اپنی محدودیت کے باعث ادراک وحی سے عاری ہے۔ چونکہ استدلال انسانی فکر و ذہن کا حاصل ہے اور اپنی محدودیت سے باہر نکلنے سے عاجز ہے، اس لیے اس میں اتنی قوت و ہمت نہیں ہے کہ وہ لا محدود تک، وحی تک اور شرقی عالموں تک، جو اپنی لطافت کے سبب استدلال کی حد رسائی سے بہت آگے ہیں، پہنچ سکے۔ ہمارے بہت سے مفکرین مغرب کے گذشتہ دو تین صدیوں کے تغیرات و انقلابات سے مرعوب ہیں، بلکہ اپنی کم تری اور پسماندگی کے احساس کا شکار ہیں اور انہوں نے یورپ کی اٹھارویں صدی کی تحریک احیاء العلوم کی اصطلاح میں حرکات کے افکار اور بالخصوص استدلال کی اصالت کے ماننے والوں کے دعووں اور اساس نادرست جدید مغربی توجیہ کو قبول کر لیا ہے کہ جو امر بھی استدلال محض سے قابل اثبات نہیں وہ ایک ذہنی، احساساتی اور ذاتی امر ہے اور ایمان و اعتقاد سے اس کا تعلق ہے۔ مقام تاسف ہے کہ ہمارے ان مفکرین نے خود کو یہ زحمت نہیں دی کہ وہ عقل اور استدلال کی ان دو واضح اصطلاحات کو باہم خلط ملط کرنے سے محترز رہیں۔ اس قسم کے بہت سے افراد کے لیے رسل، سارتر اور ڈیکارٹ اتنے ہی عاقل ہیں جتنے عاقل مولانا روم، سہروردی اور ملا صدرا تھے۔

ان بے وقعت توجیہات کو عالم اسلام میں کبھی بنیادی مقام حاصل نہیں رہا۔ اگر عقل اور وحی میں واقعی دوری ہوتی تو اسلام ابن سینا، غزالی، سہروردی، رومی، ملا صدرا اور حاجی ملا ہادی سبزواری ایسی شخصیات کو کبھی جنم نہ دے سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ عقل، اسلام میں اس وسیع اور گہرے مفہوم میں استعمال ہوئی اور ہوتی ہے، جو ایک طرف تو وحی سے متصادم و متضاد نہیں اور دوسری طرف استدلال کی اس حد تک نفی نہیں کرتا جس حد تک کہ اس میں حقیقت اور ہستی کے مبدء و اصل کے نزدیک ہونے کی قدرت و صلاحیت ہے۔ اور دوسرا بنیادی نکتہ جو یہاں پیش کرنا ہے وہ وحی اور سنت سے متعلق مؤلف کتاب کے ادراک و تشخیص کا مسئلہ ہے۔ مؤلف اپنی کتاب میں ایک جگہ دعویٰ کرتا ہے کہ جدید علوم کو اسلامی میراث یعنی قرآن اور سنت پیغمبر اکرمؐ کے معیار اور کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے دوسری جگہ وہ انسان کو عطا کی جانے والی امانت الٰہی اور انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے کی بات کرتا ہے۔ یہاں ہم امانت الٰہی اور انسان کے مقام خلافت سے متعلق اس کے نظریے کو اسی طرح نقل کرتے ہیں۔

"امانت الٰہی کا مضمون و مافیہ اور خلافت الٰہی کے نتیجے میں، فرہنگ و تمدن کا وجود اور توسیع ہے، نیز یہ صلح، امن و تحفظ زندگی اور تملک کا ضامن ہے۔ (اس کا) مقصد کسی منظم معاشرے میں انسان کو ادارے کی صورت دینا ہے جو خوراک پیدا کر سکتا ہے اور اسے کام میں لا سکتا ہے، جو خوراک کو ذخیرہ کر سکتا ہے اور سب میں مناسب کمیت و کیفیت کے ساتھ تقسیم کر سکتا ہے۔ ایسا معاشرہ جو گرم اور پر راحت مسکن، ارتباط و آمائش تیار کر سکتا ہے اور وجود میں لا سکتا ہے۔ ایسا معاشرہ جو ان مقاصد کو پورا کرنے کی خاطر ضروری اسباب و وسائل اور آخر میں تفریح کے لیے اور حسن و زیبائی کے لحاظ سے لطف اندوزی کی ضرورت کے وسائل حاصل کرے یہ خلیفہ الٰہی کا مرکزی موضوع ہے (صفحہ ۳۱) دوسری جگہ مؤلف اصرار کرتا ہے کہ" (اسلام) کے دینی و اخلاقی قوانین زندگی گزارنے، چننے اور عمل کرنے کے حقیقی عمل کو محیط نہیں، یا یہ کہ اسلام زندگی اور تاریخ کے بہاؤ میں جاگزیں ہے، اور اس بہاؤ سے باہر نہ کوئی فضیلت و تقویٰ موجود ہے اور نہ کوئی اسلام" (صفحہ ۳۱) ؟

قاری جب امانت الٰہی اور انسان کے مقام خلافت کے موضوع سے متعلق آخری نکتہ پڑھتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی وحی کے پیام کی صورت میں اس دعوے اور ایک مرفہ و خوشحال، روبہ ترقی اور صلح و آشتی سے پر کسی معاشرے کے وجود میں لانے سے متعلق جدید آدمی (ماڈرن انسان) کے دعووں میں کیا تفاوت موجود ہے؟ کیا دین کی رسالت یہ ہے کہ وہ ایسے مرفہ و منظم معاشرے کو جنم دے جس میں پیداوار اور تقسیم کا کام بطریق احسن انجام پاتے؟ اگر معاملہ ایسا ہے تو اس بات کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ کسی استثنا کے بغیر تمام ادیان شکست و ریخت سے دوچار ہیں۔ ایک طرف اگر امانت الٰہی، جو خدا نے انسان کو سونپی ہے۔ کا مطلب اور خلافت الٰہی کا مفہوم یہ ہے جو الفاروقی اور ان جیسے دوسرے افراد بیان کرتے ہیں تو ایسی کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے جس کی رو سے مارکس، فرائڈ، ڈارون اور سارتر ایسے اشخاص خدا کے خلفا اور اس کے امانت دار تسلیم کیے جائیں۔

الفاروقی اور ان تمام افراد کا، جو انسان کے دنیوی میلانات کی توجیہ کی خاطر پیام دین کی غلط تعبیر کرتے ہیں، اشتباہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو علم نہیں کہ اس بات کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے کہ کوئی دین آئے اور کوئی پیغمبر مبعوث ہو تاکہ انسان دنیا اور دنیوی امور، جس قسم کے بھی ہوں، کی طرف راغب ہوں۔ چونکہ انسانی نفس کے لیے یہ ایک طبعی اور فطری امر ہے کہ وہ دنیا اور جسمانی نفسانی ضرورتوں کی طرف متوجہ ہو، اس لیے انسان کا یہ نفسانی میلان اسی طرح فطری اور تشویق و تحریک سے بے نیاز ہے جس طرح سبزے اور چارے کی طرف خچر کا میلان وحی کا نزول اس لیے ہے کہ وہ انسان کے اس طبعی اور حیوانی میلان میں اعتدال اور تغیر لائے اور اسے اس کے وجود کے دوسرے پہلو کا بھی احساس دلائے جو الٰہیاتی، نورانی اور ابدی ہے۔ دین کو انسانی وجود کے اس پہلو سے سروکار ہے کیوں کہ یہ پہلو اس کے وجود ہی کی بدولت اعلیٰ و روحانی عالموں اور خدا کے ساتھ نسبت اصلی کا حامل ہے۔ وحی کا جوہر اور خلاصہ بھی یہ ہے کہ اس کثیف خاکی عالم کے اس پار لطیف اور نورانی

عوالم، ازلی وابدی حقائق اور آخر میں حق تعالیٰ کے بے اسم ورسم ذات پوشیدہ ہے، اور یہی وجہ ہے کہ لطیف اور نورانی عالموں کے مقابلے میں اس کثیف خاکی دنیا کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہے۔ وحی کا نزول اس لیے ہے کہ آدمی کی روح کثیف خاکی عالم میں مقید ومحبوس نہ رہے۔ اگر یہاں کوئی یہ اعتراض اٹھائے کہ اسلام تو اعتدال کا دین ہے اور وہ دنیاوی جسم وزندگی سے بے اعتنا نہیں رہتا، تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ اس نکتے کے فہم وقبول سے وابستہ یہ بات غلط ہے، کیونکہ یہ اعتدال اور جسم ودنیا اور شرع اطہر کے ڈھانچے کی طرف اسلام جس کی سفارش کرتا ہے، معقول توجہ سب لطیف عالموں اور بہشت میں پہنچنے اور خدا سے ملاقات کے لیے ہے، یعنی وہ سب وسیلے ہیں اور یہ غایت، کیونکہ اگر معاملہ اس سے ہٹ کر ہوتا تو قرآن کریم اس دنیاوی زندگی کو لہو ولعب کا نام نہ دیتا اور ہم غافلوں کو یوں نہ جگاتا کہ

وما هذه الحيوة الدنيا الا لهو و لعب و ان الدار الآخرة لهي الحيوان لو كانوا يعلمون

(عنکبوت ۶۴)

(اور یہ دنیاوی زندگی (فی نفسہ) بجز لہو ولعب کے اور کچھ بھی نہیں اور اصل زندگی عالم آخرت ہے، اگر ان کو اس کا علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے)

اس طرح ہم سمجھتے ہیں کہ علم کو اسلامی کرنا کہیں اسلامی وحی کے مسلم حقایق کی قربانی کی قیمت پر انجام پذیر نہ ہو اور یہ راستہ ترکستان کو جاتا ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ جدید علوم سے پیدا ہونے والی مشکلات اور عصر حاضر کے بے مقصد اور بے ڈھب تمدن کے مقابلے کے لیے دین، دینی حقایق اور مبدء ومعاد کے مسئلے کو آج کی انحطاط پذیر دنیا کی توقعات وضوابط کی سطح پر لے آئیں، کتاب "علم کا اسلامی کرنا" بھی نہ صرف غیر حقیقی بصیرت اور سطحی دعوے کی حد میں شامل ہے بلکہ اس مشکل سے نجات حاصل کرنے کے لیے، کہ مؤلف اور اس کے خیال میں عالم اسلام جدید تمدن کے خلاف دینی نظریات وعقائد اور مکاتب کے مقابل آنے میں اس (مشکل) سے دوچار ہے، وہ (مؤلف) اسلامی وحی کے حقایق سے بے اعتنائی اور دین کی دنیاوی تاویل وتوجیہ کا حربہ اختیار کرتا ہے۔

ایک طرف "علم کا اسلامی کرنا" یعنی چہ؟ اگر مقصد یہ ہو کہ حقایق ونتائج، بالخصوص خالص علوم PURE SCIENCES کو اسلامی کیا جائے تو یہ موضوع معنی سے بھی عاری ہے اور امکان پذیر بھی نہیں۔ ایک لحاظ سے تو علوم دقیقہ کے نتائج کو بھی کسی صورت میں غیر اسلامی یا کسی اعتبار سے غیر دینی نہیں کہا جا سکتا، مطلب یہ کہ علوم اپنے انتہا کے امر میں اور اپنی تحقیقات کی انتہائی جزئیات میں بھی کسی ایسے نتیجے پر نہیں پہنچے ہیں جو شہادت ذات اور مظاہر فطرت کے اصل ومبدء کے انکار کی دلیل ہو۔ ہاں علوم انسانی واجتماعی کا مسئلہ کہ اس میں انسان کے عقاید اور تصرف بے حد بنیادی کردار کے حامل ہیں، ایک دوسرا مسئلہ ہے جس سے قدرتی طور پر کسی اور ڈھنگ سے بھی نمٹنا چاہیے) لہٰذا وہ مسئلہ کیا ہے جس نے دین کیلیے بطور کلی اور اسلام کے لیے بھی مشکل پیدا کر رکھی ہے؟ اس حقیر کی نظر میں جدید علوم کا ادیان (مع دین اسلام) کے ساتھ ٹکراؤ یا تقابل کا مسئلہ دو بنیادی نکتوں میں مختصراً یوں ہے۔

اول:- جدید علوم کے دانشمندوں کا دعویٰ کہ علم تمام بشری سوالات کا جواب دے گا اور انسان کے لیے کوئی

مسئلہ لاینحل نہ چھوڑے گا۔ یقیناً جدید علوم کا یہ دعویٰ آغاز میں تھا اور بعد میں کچھ زیادہ ہی مسائل سامنے آئے جن کے سبب اس دعوے میں اعتدال آگیا۔ اس کے باوجود آج بھی بہت سے اصحاب دانش، خاص طور پر وہ دانشمند جو فکری اور فلسفیانہ لحاظ سے "علم زدہ" ہیں، اس دعوے پر قائم ہیں۔

دوئم: علم و معرفت کے تمام طریقوں کو کسی جدید علم کی روش تک محدود کرنا جو قدرتی طور پر مادی اور محدود ہے اور جو زیادہ تر مادی اور معمولی امور کی حد سے آگے نہیں بڑھتا اور یہ دعویٰ کہ جو کچھ بھی کسی جدید علم کی روش کے ڈھانچے میں نہیں سماتا وہ ایک غیر مربوط اور غیر علمی مسئلہ ہے۔ لازم ہے کہ جدید علوم کے پیدا کردہ مسائل کے سلسلے میں دینی افکار و نظریات معقول، محکم اور منطقی انداز میں مندرجہ بالا دو مسلکوں کے مقابل آئیں۔ اگر یہ دو مسئلے حل ہو جائیں تو ادیان کے ساتھ جدید علوم کا تقابل بظاہر زیادہ قابل برداشت ہوگا۔ افسوس کہ الفاروقی نے اس مسئلہ پر کسی طرح بھی غور و تامل سے کام نہیں لیا۔ الفاروقی کے طرز فکر پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ وہ جدید دنیا کے مسائل پر تنگ، محدود و فرقہ وارانہ زاویے سے نگاہ ڈالتا ہے۔ جبکہ ضروری ہے کہ اسلام کے تمام فکری و فلسفیانہ، عرفانی اور علمی منابع اور تمام اسلامی قوتوں کو کام میں لایا جائے۔ جدید دنیا کے ساتھ تقابل جدید مفہوم اور آج کے انحطاط یافتہ اور خلاف دین نظریات کا مسئلہ کوئی چھوٹا مسئلہ نہیں ہے جسے تنگ نظرانہ اور تعصب آمیز موقف سے حل کیا جا سکے۔ کتاب زیر تبصرہ کا مثبت پہلو اس نکتہ پر زور ہے کہ طلباء کو وسیع سطح پر اسلامی علوم و معارف سے آشنا کرنا چاہیئے۔ یہ سوچ اچھی ہے اور تمام اسلامی یونیورسٹیوں میں اس کی پیروی ضروری ہے۔ پھر اس خاطر کہ دوسروں کا حق ضائع نہ ہو، الفاروقی سے قبل بہت سوں نے اس نکتہ کی طرف توجہ کی اور عملی طور پر اس ضمن میں کام کیا ہے اور عالم اسلام میں لائق غور و توجہ تالیفات رقم کی ہیں، لیکن یہ اہم کہ کوشش کسی تعصب اور فرقہ پرستی کے ساتھ توام نہیں ہونی چاہیئے۔ اس پروگرام میں جو الفاروقی نے اپنی کتاب کے صفحات ۵۷ اور ۵۸ پر یونیورسٹی کا تعلیمی پروگرام اسلامی تمدن سے آشنائی کے عنوان سے دیا ہے اس میں اولاً اسلام کے فکری، فلسفیانہ اور عرفانی علوم و معارف کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ یعنی ان معارف کا اہم ترین حصہ ایک طرف رکھ دیا گیا ہے، جو اگر خوب جانا اور پیش کیا جائے تو جدید دنیا کے افکار، نظریات اور انحرافات سے متعلق بہت سی مشکلات و مسائل کا ٹھیک ٹھیک جواب دے سکتا ہے۔

انسان جب عصر حاضر کی پریشان حال دنیا میں اس قسم کے افراد کے افکار و عقاید اور تحریروں سے دوچار ہوتا ہے، جو دین اور وحی سے متعلق اپنے کمزور اور سست فہم و شعور کے ساتھ دوسروں کی امت مسلمہ کی اور آخر پوری نوع انسان کی ہدایت و ارشاد کے درپے ہو جاتے ہیں، تو وہ حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے اور رکھنے کے مسئلے کی اہمیت سے کسی حد تک آگاہ ہو جاتا ہے جس کی طرف دین میں اور دینی و روحانی معارف میں بہت اشارہ کیا جاتا ہے۔ مولانا رومیؒ کے فرمان کے مطابق، جس کسی میں امتیاز کرنے کی اہلیت ہے اس نے حق اور باطل میں فرق کو جان لیا اور اس اہلیت کے وسیلے سے وہ مومن ہو گیا، تو ہم نے جان لیا کہ ایمان تمیز ہے۔

مطالعۂ اقبال کے چند پہلو

میرزا ادیب
مبصر : ڈاکٹر وحید عشرت

ناشر۔ بزم اقبال ۲ کلب روڈ لاہور
مجلّد، ٹائپ میں، سفید کاغذ صفحات ۲۳۵ قیمت ۲۵/- روپے

میرزا ادیب ہمارے عہد کے ایک بزرگ صاحب قلم ہیں جن کی تحریر کی دل آویزی اور اور سلاست نے ہر شخص کو متاثر کیا ہے۔ میرزا ادیب کی زبان کی سادگی اور شگفتگی ان کا اصل جوہر ہے۔ بڑی سے بڑی بات بھی وہ اتنے آسان اور سہل انداز سے بیان کر دیتے ہیں کہ داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ ہمارے عہد کے ادیبوں کی ایک نسل ان کی تحریروں سے متاثر ہے۔ انھوں نے مدیر ادب لطیف ہوتے ہوئے کئی معروف اہل قلم کو نہ صرف متعارف کرایا بلکہ انہیں اردو زبان کے اسالیب سے بھی بہرہ ور کیا۔

زیر تبصرہ کتاب میرزا ادیب کے آٹھ اہم مقالات کا مجموعہ ہے۔ جو اپنے موضوع کے اعتبار سے بڑے متنوع ہیں ان مقالات میں علامہ اقبال بچوں کے لیے، علامہ اقبال کی ایک مثنوی مسافر، علامہ اقبال کی ایک اور مثنوی پس چہ باید کرد علامہ اقبال کی دعائیں، علامہ اقبال اور مغربی تہذیب، علامہ اقبال کا ایک مثالی شہر، علامہ اقبال اور کرمک شب تاب اور علامہ اقبال کی حکایات شامل ہیں۔ اس مجموعۂ مقالات کے شروع میں ممتاز ماہر اقبالیات اور اقبال اکادمی پاکستان کے ناظم پروفیسر محمد منور کا فکر انگیز دیباچہ بھی شامل ہے جو خود ایک اہم مقالہ ہے جس میں میرزا ادیب کی شخصیت اور فن کے تعارف کے پہلو بہ پہلو پروفیسر صاحب نے تہذیب فرنگ کے حوالہ سے علامہ اقبال کے خیالات کا بصیرت افروز تجزیہ و مطالعہ پیش فرمایا ہے کہ علامہ کن معنوں میں یہ تصور فرماتے تھے کہ مغربی تہذیب انسان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے اور ہم کس اندھی تقلید سے مغرب کے پیچھے پیچھے اسی اندھے گڑھے میں گرنے جا رہے ہیں جس کی طرف مغرب بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ انسان کی بحیثیت انسان اگر ترقی کا گراف گرنے لگے تو اس کی مادی ترقی کا گراف اس کے لیے نئے عذابات کا باعث بننے لگتا ہے جس طرح پوری تہذیب کی مادی ترقی ہلاکت خیز اسلحہ، زندگی کی بے معنویت، فواحش اور لوٹ کھسوٹ کے ہاتھوں بے امان

ہو رہی ہے اور اعلیٰ تصورات اور مقاصد سے تہی ہو کر انسانوں کو دوشش کی سطح پر لے آئی ہے اس کا جو انجام ہونے والا ہے وہ کسی بھی چشم بصیر سے مخفی نہیں اور ہم ہیں کہ بلا سوچے سمجھے اس آگ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہم مغربی تہذیب کے مثبت خواص سے زیادہ ان کی برائیوں سے اپنا دامن تار تار کر رہے ہیں۔ اسی طرح پروفیسر صاحب نے اس غلط فہمی کو بھی دور کیا ہے کہ علامہ اقبال بادشاہوں اور درباروں کی طرف اپنا رجحان رکھتے تھے۔ ان کا یہ نقطۂ نظر نہایت صائب ہے کہ علامہ انسانی عظمت اور کمال کے متلاشی تھے چنانچہ نادر شاہ، میسولینی اور دیگر ہم عصر شخصیات میں انہیں جہاں بھی انسانی کمال کی جھلک نظر آئی انہوں نے دل کھول کر اس کی تحسین کی خواہ وہ اورنگ زیب عالمگیر اور سلطان ٹیپو تھے یا کارل مارکس اور نیٹشے۔

میرزا ادیب کے یہ مقالات بیانیہ اور توضیحی ہیں انہوں نے علامہ اقبال کے تصورات کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنے تعصبات کو سامنے آنے نہیں دیا۔ بلکہ علامہ کے کلام کی خصوصیات سے بہرہ ور کرنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ اقبال بچوں کے لیے ایک نہایت جامع مقالہ ہے جس میں میرزا صاحب نے محمد حسین آزاد اور اسماعیل میرٹھی کی بچوں کے لیے نظموں کے حوالے سے علامہ کی بچوں کے لیے نظموں کا تجزیہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ خود فارسی میں بھی نئی نسل کے لیے علامہ نے بعض اہم نظمیں لکھیں میرزا ادیب صاحب کا یہ مقالہ اور بھی خوب ہوتا اگر وہ بچوں کے لیے علامہ کی شاعری کو عالمی تناظر میں رکھ کر دیکھتے کہ علامہ نے کس طرح اہم اور سبق آموز نظمیں ایسی آسان اور سلیس زبان میں لکھی ہیں کہ بچوں کے لبوں پر آج بھی وہ چل رہی ہیں اور ابھی تک کوئی شاعر ایسا پیدا نہیں ہوا جسے بچوں میں علامہ سے زیادہ مقبولیت حاصل رہی ہو۔

میرزا ادیب کے دو مضامین جو مثنوی مسافر اور پس چہ باید کرد پر ہیں۔ مثنوی مسافر میں میرے نزدیک علامہ اقبال نے غلام برصغیر پاک و ہند کو آزاد افغان معاشرے کی تصویر دکھانے کی کوشش کی تاکہ ان میں بھی آزادی کی اُمنگ پیدا ہو اور مثنوی پس چہ باید کرد ایک دعوت عمل تھی جو دینائے اسلام کو دی گئی۔ ان دونوں مثنویوں کو اسی سیاق و سباق میں دیکھنا ہوگا۔ محاسن زبان سے زیادہ ان مقاصد کو پیش نظر رکھنا چاہیئے جو علامہ چاہتے تھے۔ میرزا صاحب نے ان دونوں مثنویوں کی اہمیت واضح کرنے پر خصوصی توجہ دی ہے۔ میرزا ادیب کا چوتھا مقالہ علامہ اقبال کی دعاؤں پر مبنی ہے۔ حقیقت پر خود علامہ نے بھی اپنے تیسرے خطبہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں بلیغ خیالات کا اظہار کیا ہے کہ

"دعا خواہ انفرادی ہو خواہ اجتماعی، ضمیر انسانی کی اس نہایت درجہ پوشیدہ آرزو کی ترجمان ہے کہ کائنات کے ہولناک سکوت میں وہ اپنی پکار کا کوئی جواب سنے۔" (ص ۱۳۹)

"باعتبار نفسیات دعا یا عبادت ایک جبلی امر ہے۔" (ص۔ ۱۳۵)

"دعا وہ چیز ہے جس کی انتہا روحانی تجلیات پر ہوتی ہے۔" (ص۔ ۱۴۳)

علامہ کی دعاؤں کو اسی مابعد الطبیعیاتی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ کہ علامہ دعا کو انسانی زندگی کے لیے کس قدر ناگزیر تصور کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے اردو اور فارسی کلام میں ان کی دعائیں ایک خاص غایت رکھتی ہیں۔ میرزا ادیب نے اپنے اس مقالہ میں ان کا جائزہ لے کر ان کی اہمیت دو چند کر دی ہے۔

اگرچہ علامہ سے قبل بھی چند ایک شعراء نے مغربی تہذیب پر حرف گیری کی اور بعض علماء نے اس کے مضر اثرات کو نمایاں کیا مگر جس محکم علمی بنیاد پر علامہ اقبال نے مغربی تہذیب کے خلاف محاکمہ قائم کیا اس نے چند جیالی ہوئی اور سرسید کی مرعوب کردہ قوم کی آنکھیں کھول کر رکھ دیں۔ علامہ کے مغربی تہذیب کے خلاف محاکمہ کے پس منظر اور پیش منظر کو میرزا ادیب نے ان کی اردو اور فارسی نظموں کے حوالے سے اجاگر کیا ہے۔ اس مضمون کی جامعیت میں اضافہ کرنے کے لیے اگر میرزا صاحب علامہ کے خطبات کو بھی مطالعہ میں لے آتے تو زیادہ بہتر طور پر ان فکری کاوشوں سے بھی آگاہی ہو جاتی جو علامہ نے تہذیب مغرب کی مخالفت میں اساس کے طور پر اپنے پیش نظر رکھیں۔

ایک مثالی سماج مثالی ثقافت و معاشرت کی تشکیل ہر فلسفی، دانشور اور صاحب فکر انسان کی سوچوں کا مرجع رہی ہے۔ افلاطون، فارابی، الماوردی، ٹامس مور، آگسٹ کومت، کارل مارکس اور علامہ اقبال کی آرزوؤں کا بھی مرکز یہ مثالی سماج رہا ہے۔ ان تمام دانشوروں نے اس مثالی سماج کی تشکیل کے لیے ایک مثالی شہر کا نقشہ اپنی تحریروں میں چھوڑا ہے۔ اگرچہ میرزا ادیب نے افلاطون کے مدینۃ الفاضلہ کا تذکرہ نہیں کیا اور صرف مغربی مفکروں کے حوالے سے ہی بات کی ہے تاہم یہ مضمون ایک اہم تحریر ہے جسے انہوں نے پیام مشرق کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ اور علامہ کے مثالی شہر "مرغدین" کا تعارف کرایا ہے۔

میرزا ادیب کے دوسرے دو مقالات علامہ اقبال اور کرمک شب تاب اور علامہ اقبال کی حکایات بھی دلچسپ مقالات ہیں، یہ تمام مقالات پروفیسر محمد منور کے الفاظ میں اقبالیات میں ایک قیمتی اضافہ ہیں اور اپنے تنوع اور اسلوب بیان کے حوالے سے قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔

جامعہ عثمانیہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی

تبصرہ: ڈاکٹر وحید عشرت

ناشر۔ بہادر یار جنگ اکادمی
سراج الدولہ روڈ۔ بہادر آباد کراچی
پیپر بیک، سفید کاغذ، صفحات ۱۳۵، قیمت ۳۰ روپے

جامعہ عثمانیہ، دیوبند، علی گڑھ یونیورسٹی دار العلوم ندوہ اور اسلامیہ کالج لاہور ہماری تاریخ میں اہم تعلیمی ادارے ہیں جنھوں نے ہماری شناخت اور ذہنی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے ان تمام اداروں میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کو کئی امتیازات حاصل ہیں۔ یہاں ایک خاص منصوبہ بندی اور مقصد کے تحت تعلیم دی جاتی تھی۔ قدیم اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کی بھی تدریس کی جاتی اور سب سے بڑھ کر یہ تمام علوم اردو زبان میں پڑھائے جاتے۔ یہاں تعلیم پانے پر ماہر تمام اساتذہ نے علمی دنیا میں اپنے کمالات سے دھوم مچا دی اور ایسے ایسے شاگرد پیدا کیے جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ سے وابستہ اساتذہ میں سے مولانا حمید الدین فراہی، عبد القدیر صدیقی، مولوی عبد الحق، مولوی سید ابراہیم، وحید الدین سلیم پروفیسر وحید الرحمن، ابن بی ویلنکر، پروفیسر حسین علی خاں، پروفیسر سید عبد اللطیف، پروفیسر ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم، پروفیسر ہارون خان شیروانی، پروفیسر الیاس برنی، مولانا مناظر احسن گیلانی، پروفیسر محمود احمد خان، نصیر احمد عثمانی، پروفیسر ابن حسن، پروفیسر حبیب الرحمن، اور پروفیسر ویرا بدرو اور صاحب کتاب ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی شامل تھے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کو اس میں بحیثیت طالب علم، استاد اور رئیس جامعہ ہونے کا بھی فخر حاصل ہے۔ لہٰذا ان سے بڑھ کر اس ادارے کے بارے میں کون روشنی ڈال سکتا ہے۔ اسی ادارے کی ایک خصوصیت اس کا شعبہ ترجمہ تھا جس نے نہایت اہم انگریزی کتب کو اردو زبان کے قالب میں ڈھالا، اردو اصطلاحات کی تشکیل و تعمیر اور انگریزی، فرانسیسی اور جرمن اصطلاحات کو اردو میں ڈھالنا اس جامعہ کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ یہ ادارہ ہماری تہذیب پہچان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کاش پاکستان میں بھی اس طرز پر کوئی ادارہ وجود میں لایا جاتا۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی نے نہایت فاضلانہ انداز بیان کے ساتھ اس جامعہ کی تشکیل اس کی خدمات اور دیگر ضروری امور کی طرف اشارے کیے ہیں تاہم انھی اس ادارے کے بارے میں مزید لکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ کتاب اس ادارہ کی ضرورت کی طرف اشارہ کرتی ہے اس ضرورت کو مکمل پورا نہیں کرتی

توضیحی فہرستِ کتب خانۂ ہمدرد

مبصر: ڈاکٹر وحید عشرت

اشاعت ہائے خاص اردو رسائل

مرتبہ۔ کلیم نعیم الدین زبیری
ناشر۔ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس کراچی
عمدہ کاغذ، مجلد، خوبصورت سرورق رنگین، صفحات ۲۷۰، قیمت ۴۵ روپے

کتب خانہ ہمدرد جس میں کم و بیش پچاس ہزار کتب اور بڑی تعداد میں مخطوطات بھی شامل ہیں کے شعبہ رسائل میں موجود اہم اشاعتوں پر مبنی یہ کتاب بڑی اہم ہے اس سے ان رسائل کا ایک اجمالی سا تعارف بھی حاصل ہوتا ہے اور ان رسائل کے مندرجات سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ فاضل مرتب نے تاہم ان رسائل کی فہرست ہائے مضامین دینے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ اگر ان مضامین کا ملخص بھی چند سطروں میں دے دیتے تو یہ مزید مفید ہوتا بہرحال اتنا بھی غنیمت ہے اور توقع کرنی چاہیئے کہ وہ کتب خانہ ہمدرد کے مخطوطات اور دیگر کتب کی بھی فہرست مرتب کریں گے تاکہ اہل علم ان سے استفادہ کر سکیں۔